ISSN 1992-5018

ISLAMABAD LAW REVIEW

Quarterly Research Journal of Faculty of Shariah & Law, International Islamic University, Islamabad

Volume 3, Number 3&4, Autumn/Winter, 2019

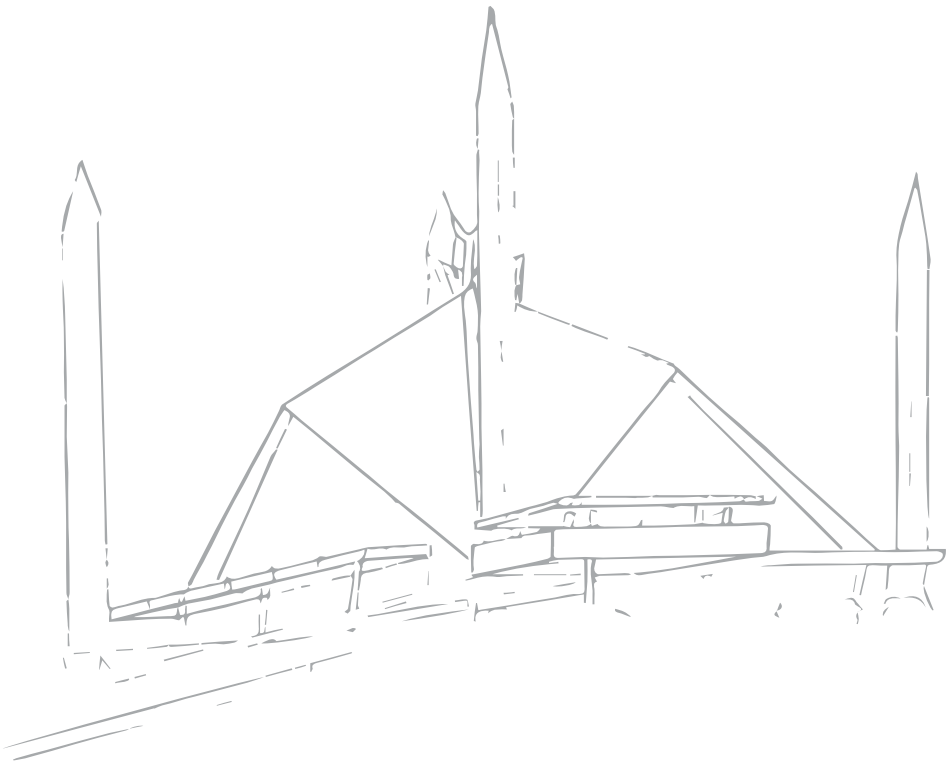

شاہ رخ جتوئی کیس: کیا مسئلہ قصاص ودیت کے قانون میں ہے؟

محمد مشتاق احمد*

شاہ رخ جتوئی کیس کی بنیاد پر ایک بار پھر قصاص ودیت کے پاکستانی قانون، اور پھر چھلانگ لگا کر اسلامی قانون، کے خلاف کئی لوگوں نے محاذ کھول دیا ہے۔ کوئی "انصاف کی نجکاری" کی دُہائی دے رہا ہے تو کوئی عدلیہ پر تبرا کر رہا ہے اور سارے شور میں اصل سوالات پر بحث ہی نہیں ہو پا رہی۔ سر دست چند نکات پیشِ خدمت ہیں۔

قصاص ودیت کا قانون کیسے بنا؟

قصاص ودیت کا قانون پاکستان میں طویل مباحثے اور مذاکرے کے بعد وجود میں آیا ہے۔ یہ کسی ''ڈکٹیٹر کا مسلط کیا گیا قانون'' نہیں ہے، جیسا کہ بعض ناقدین مسلسل کہہ رہے ہیں۔ شاید یہ پاکستان کا واحد قانون ہے جسے قانون سازی کے مرحلے سے گزرنے میں اٹھارہ سال لگے اور ان اٹھارہ سالوں میں چھے حکومتوں کے ادوار آئے (نگران حکومتیں ان چھے حکومتوں کے علاوہ ہیں)۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ قصاص ودیت کے آرڈی نینس کا پہلا مسودہ اسلامی نظریاتی کونسل نے حدود آرڈی نینسز کے مسودات کے ساتھ ۱۹۷۹ء میں ہی بنالیا تھا لیکن اس مسودے کو جنرل ضیاء الحق نے آرڈی نینس کی صورت میں نافذ نہیں کیا بلکہ یہ مختلف وزارتوں کے افسران کے درمیان ہی گھومتا رہا۔ پھر ۱۹۸۰ء میں کونسل نے دوسرا مسودہ بنا کے دے دیا۔ اس پر بھی مختلف وزارتوں کے اعتراضات رہے تو تیسرا مسودہ ۱۹۸۲ء میں کونسل نے تیار کیا۔ وہ مسودہ وفاقی کونسل (جو اس وقت پارلیمان کا کام کر رہی تھی) کو پیش کیا گیا اور دو سال مختلف کمیٹیوں میں زیر بحث رہنے کے بعد بالآخر ۱۹۸۴ء میں منظور کیا گیا لیکن جنرل صاحب نے اس پر دستخط نہیں کیے۔ ۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۹ء تک کے دور میں (جب پہلے محمد خان جونیجو صاحب کی حکومت آئی اور پھر محترمہ بے نظیر بھٹو کی) یہ مسودہ سرد خانے میں ہی پڑا رہا لیکن پھر حکومت کو مجبوراً اس پر بحث کرنی پڑی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۷۹ء میں گل حسن خان نامی ایک شخص نے پشاور ہائی کورٹ کی شریعت بنچ کے سامنے مجموعۂ تعزیراتِ پاکستان اور ضابطۂ فوجداری کی دفعات کو اس بنیاد پر چیلنج کیا تھا کہ ان دفعات کی رو سے قتل کے جرم

* ایسوسی ایٹ پروفیسر قانون، کلیہ شریعہ و قانون، ڈائریکٹر جنرل شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد۔
mushtaqahmad@iiu.edu.pk

میں معافی یا صلح کی گنجائش نہیں ہے، جبکہ شرعاً مقتول کے ورثا کو یہ حق حاصل ہے۔ پشاور ہائی کورٹ نے ۱۹۸۰ء میں فیصلہ سنادیا کہ مذکورہ دفعات شریعت سے متصادم ہیں اور مقتول کے ورثا کو شرعاً معافی یا صلح کا حق حاصل ہے۔ اس طرح کے کئی اور مقدمات دیگر ہائی کورٹس کے سامنے بھی موجود تھیں۔ تو جنرل ضیاء الحق نے ہائی کورٹس کی شریعت بنچوں کو ختم کر کے ان کی جگہ ایک مرکزی عدالت ''وفاقی شرعی عدالت'' کے عنوان سے قائم کی اور یہ سارے مقدمات اس عدالت کو منتقل ہوئے۔ وفاقی شرعی عدالت کے پانچ رکنی بنچ نے ۱۹۸۰ء میں محمد ریاض کیس میں تین—دو کی اکثریت سے وہی فیصلہ سنادیا جو گل حسن کیس میں پشاور ہائی کورٹ نے سنایا تھا۔ وفاقی حکومت ان دونوں فیصلوں کے خلاف اپیل میں سپریم کورٹ میں گئی جہاں دیگر ۹ مقدمات کے ساتھ ان دو مقدمات کی اکٹھے سماعت ہوئی اور ۱۹۸۹ء میں پانچ رکنی بنچ نے متفقہ فیصلے کے ذریعے وفاقی شرعی عدالت اور پشاور ہائی کورٹ کے فیصلے کو برقرار رکھا۔

اس فیصلے کی رو سے حکومت کو اس قانون میں تبدیلی کے لیے ۲۳ مارچ ۱۹۹۰ء تک کا وقت دیا گیا۔ پھر مذکورہ مدت میں حکومت کی مسلسل درخواستوں کے نتیجے میں اضافہ کیا جاتا رہا یہاں تک کہ سپریم کورٹ نے ہاتھ کھڑے کر دیے کہ مزید وقت نہیں دیا جاسکتا۔ اس دوران میں محترمہ کی حکومت ختم ہو چکی تھی۔ چنانچہ غلام مصطفی جتوئی صاحب کی نگران حکومت نے ستمبر ۱۹۹۰ء میں قصاص ودیت آرڈی نینس جاری کروایا۔ یہ اس قانون کے نفاذ کی ابتدا تھی۔

اکتوبر ۱۹۹۰ء میں میاں نواز شریف صاحب کی حکومت آئی تو اس آرڈی نینس کو نو منتخب قومی اسمبلی کے سامنے رکھا گیا جس نے اسے مختلف کمیٹیوں کے سپرد کیا اور ڈھائی سال بعد بالآخر جون ۱۹۹۳ء میں یہ مسودہ واپس قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا جس نے جولائی ۱۹۹۳ء میں اس کی منظوری دی لیکن اگلے ہفتے قومی اسمبلی ہی تحلیل کر دی گئی۔ انتخابات کے بعد پھر محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت آئی اور ان کے دورِ حکومت میں پارلیمان سے یہ مسودہ منظور نہیں کیا جاسکا۔ فروری ۱۹۹۷ء میں انتخابات کے نتیجے میں میاں نواز شریف صاحب کی حکومت آئی تو اپریل ۱۹۹۷ء میں بالآخر پارلیمان کے دونوں ایوانوں نے قصاص و دیت کے ایکٹ کی منظوری دے کر اس قانون کو مجموعۂ تعزیراتِ پاکستان کے سولہویں باب میں شامل کر لیا۔

واضح رہے کہ ایکٹ کی صورت میں نافذ ہونے سے قبل اسے ستائیس دفعہ (جی ہاں ستائیس دفعہ!) آرڈی نینس کی صورت میں جاری کرنا پڑا۔ اتنے طویل مذاکرے، مباحثے اور مکالمے کے دوران میں اس قانون میں مختلف ترامیم

بھی کی گئیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ ترامیم کا سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا جن میں بالخصوص جنرل مشرف کے دور میں ۲۰۰۵ء میں کی گئی ترامیم اہم ہیں۔ بعد میں بھی ترامیم ہوتی رہیں تاآنکہ یہ قانون اس شکل میں آیا جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔

انصاف کی نجکاری؟

یہ اعتراض کہ اس قانون کے ذریعے مقتول کے ورثا کا حق مان کر انصاف کی نجکاری کی گئی ہے، اس مفروضے پر مبنی ہے کہ جرم ریاست کے حق کی خلاف ورزی کا نام ہے۔ انگریزی قانون کا یہ مفروضہ اپنی مطلق حیثیت میں اسلامی قانون کی رو سے صحیح نہیں ہے۔

انگریزی قانون میں قانون کی خلاف ورزیوں کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے: فرد کے قانونی حق کی خلاف ورزی (ایسی خلاف ورزی کو ٹارٹ اور ایسے مقدمے کو سِول مقدمہ کہا جاتا ہے) اور ریاست کے حق کی خلاف ورزی (ایسی خلاف ورزی کو کرائم اور ایسے مقدمے کو کریمینل مقدمہ کہا جاتا ہے۔) سول کیس میں دعوی دائر کرنے کا اختیار متاثرہ فرد کے پاس ہوتا ہے، ثابت کرنا بھی اس کی ذمہ داری ہوتی ہے اور خلاف ورزی کرنے والے کے ساتھ سمجھوتا کرنے کا یا اسے معاف کرنے کا اختیار بھی اس کے پاس ہوتا ہے۔ اس کے برعکس کریمینل کیس میں مقدمے کا حق ریاست کے لیے مانا جاتا ہے، جرم کا ثابت کرنا ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے اور جرم ثابت ہونے پر مجرم کو سزا دی جاتی ہے، خواہ جرم سے براہِ راست متاثر ہونے والا فرد اسے معاف کرنا چاہے۔ اس تصور کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جرم سے براہِ راست متاثر ہونے والا شخص ثانوی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور انگریزی قانون اپنی اصل شکل میں اسے پہنچنے والے نقصان کی تلافی کے لیے کوئی راستہ نہیں بتاتا۔

اسلامی قانون میں اس کے برعکس یہ ضروری نہیں کہ ہر جرم کو نظمِ اجتماعی کے حق کی خلاف ورزی قرار دیا جائے؛ بلکہ اسلامی قانون کی رو سے کرائم کی تین بنیادی قسمیں ہیں: اللہ کے حق کی خلاف ورزی (ایسے جرائم کی سزا کو حدود کہتے ہیں)؛ فرد کے حق کی خلاف ورزی (ایسے جرائم کی سزا کو تعزیر کہتے ہیں) اور نظمِ اجتماعی کے حق کی خلاف ورزی (ایسے جرائم کی سزا کو سیاسہ کہتے ہیں)۔ کبھی ایک ہی جرم سے دو مختلف حقوق بیک وقت متاثر ہو رہے ہوتے ہیں تو پھر اسے دیکھا جاتا ہے کہ کون سا حق غالب ہے؟ قصاص کے متعلق فقہاے کرام کہتے ہیں کہ اس میں حق اللہ بھی ہے اور حق العبد بھی لیکن حق العبد اس میں غالب ہے۔ آسان الفاظ میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ متعلقہ

فرد کے پاس مجرم کی معافی کا اختیار ہے لیکن وہ معاف نہ کرے تو پھر اس سزا کا نفاذ لازم ہے۔ (حدود میں کسی کے پاس معافی کا اختیار نہیں ہوتا، اس لیے انھیں حقوق اللہ کہا جاتا ہے)۔

اسلامی قانون کے ان تصورات کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فوجداری مقدمات میں بھی متاثرہ فریق کو پہنچنے والے نقصان کی تلافی مجرم کی جانب سے کی جاتی ہے۔ چنانچہ مجرم (یا اس کے اعوان وانصار کو، جنھیں عاقلہ کہا جاتا ہے) مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ متاثرہ فریق کو دیت ادا کردے، یا اگر زخمی کیا ہے تو ارش ادا کردے۔ واضح رہے کہ اسلامی قانون کا یہ تصور (جرم کے متاثرین کو پہنچنے والے نقصان کی تلافی) کو اب مغربی ممالک اپنے قوانین میں، بلکہ بین الاقوامی قانون میں بھی، رائج کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔

اسلامی قانون کے ان تصورات کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ مجرم اور متاثرہ فریق کے درمیان مزید دشمنیوں کا سدباب ہو جاتا ہے اور جرم در جرم کا سلسلہ رک جاتا ہے۔ یہ بھی یاد دلاؤں کہ مغربی ممالک بھی فوجداری قوانین میں plea bargain اور out of the court settlement کے تصورات اگر ایک جانب عدالت میں مقدمات کا بوجھ کم کرنے کے لیے ہوتے ہیں، ویسے ہی معاملہ کسی طرح ختم کرنے کے لیے بھی ہوتا ہے۔ تاہم اس میں یہ امکان ہوتا ہے کہ طاقتور فریق نظامِ عدل کا مذاق نہ بنالیں۔

فقہاے کرام اس معاملے کو یوں دیکھتے ہیں کہ کیا کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ قتل کے مقدمے میں نظمِ اجتماعی کا حق بھی متاثر ہو جائے اور اس بنا پر مقتول کے ورثا کے معاف کر دینے کے باوجود عدالت مجرم کو سزا دے سکے؟ اس کا جواب فقہاے کرام اثبات میں دیتے ہیں اور وہ کئی صورتیں ذکر کرتے ہیں جن میں وہ قرار دیتے ہیں کہ یہ جرم محض قتل کا جرم نہیں تھا بلکہ عمومی فساد کے زمرے میں آتا ہے اور اس وجہ سے اس جرم پر سیاسۃً سزا دی جا سکتی ہے۔ بلکہ بعض سنگین صورتوں میں وہ تصریح کرتے ہیں کہ ان صورتوں میں سیاسۃً سزاے موت بھی دی جا سکتی ہے۔

پاکستان میں رائج قانون میں بھی یہ اصول مانا گیا ہے۔ چنانچہ مجموعۂ تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ۳۱۱ میں تصریح کی گئی ہے کہ اگر جرم محض قتل نہیں ہے بلکہ اس طرح کیا گیا ہے کہ وہ فساد فی الارض کے زمرے میں آتا ہے تو عدالت مجرم کو تعزیری سزا دے سکتی ہے، خواہ مقتول کے تمام ورثا نے اسے معاف کر دیا ہو۔ ۲۰۰۵ء میں کی گئی ترمیم کے بعد سے عدالت تعزیری سزا کے طور پر سزاے موت بھی سے سکتی ہے۔

اگر اسلامی اور پاکستانی قانون کی رو سے صورتِ معاملہ یہ ہے تو پھر کیسے طاقتور فریق سزا سے بچ جاتے ہیں؟ اس سوال پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ مسئلہ قصاص ودیت کے اسلامی یا پاکستانی قانون میں نہیں بلکہ کہیں اور ہے۔

مسئلہ کہاں ہے؟

مسئلے کی جڑ تک پہنچنے کے لیے چند حقائق پر غور کریں۔ شاہ رخ جتوئی کیس کی ابتدا میں مقدمے میں انسدادِ دہشت گردی کے قانون کی دفعات شامل کی گئی تھیں اور مقدمہ انسدادِ دہشت گردی کی عدالت نے ہی سنا جس نے شاہ رخ جتوئی کو سزاے موت سنادی۔ اس فیصلے کے خلاف اپیل کی سماعت ہائی کورٹ میں ہوئی اور وہاں یہ قرار دیا گیا کہ چونکہ جرم کے وقت شاہ رخ جتوئی 'نوخیز نوجوان' (juvenile) تھا اس لیے اس پر دہشت گردی کا مقدمہ قائم نہیں ہو سکتا تھا۔ اس بنا پر مقدمہ اور ساری کارروائی غلط قرار پائی اور ہائی کورٹ نے مقدمہ واپس نیچے بھجوا دیا تاکہ سیشن عدالت عام فوجداری قانون کی رو سے اس مقدمے کی سماعت کرے۔ سیشن عدالت میں اب مقدمہ مجموعۂ تعزیراتِ پاکستان کی دفعات کے تحت چلایا گیا اور استغاثے نے فساد فی الارض کی دفعہ ۳۱۱ مقدمے میں شامل ہی نہیں کی۔ سیشن عدالت میں مقتول کے والد نے مجرم کی معافی کا اعلان کیا تو قصاص کی سزا دینی ممکن نہیں رہی۔ استغاثے کے پاس یہ آپشن تھا کہ وہ تعزیری سزا کے لیے دلائل دیتی لیکن استغاثے کی جانب سے راضی نامے اور مجرم کی ضمانت پر رہائی پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا۔ چنانچہ عدالت کے پاس مجرم کو ضمانت پر رہائی کا حکم دینے کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں بچا تھا۔

اب ان حقائق کی روشنی میں دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ مسئلے کی جڑ قصاص ودیت کے قانون میں نہیں، بلکہ درج ذیل تین امور میں ہے:

أ. حقوقِ انسانی کے بین الاقوامی قانون کے دباو کی وجہ سے پاکستانی قانون میں 'نوخیز مجرموں' کے لیے تخفیف کا عنصر لیکن ظاہر ہے کہ حقوقِ انسانی کے بین الاقوامی قانون پر تنقید کم از کم ان لوگوں کے بس میں نہیں ہے جو ہر معاملے میں اسلامی قانون کو ہی مسائل کا سبب گردانے کے عادی ہو چکے ہیں؛

ب. استغاثے کی کمزوری جس کی بنا پر مقدمہ پہلے غلط عدالت میں چلایا گیا، پھر جب قانوناً صحیح عدالت میں آیا تو وہاں وہ دفعات شامل ہی نہیں کی گئیں جن کی رو سے مجرم کو قصاص کی معافی کی صورت میں بھی تعزیر کی سزا دی جا سکتی تھی اور جب عدالت میں راضی نامہ پیش کیا گیا تو استغاثے نے ضمانت پر رہائی پر کوئی اعتراض ہی نہیں کیا؛

ج. پاکستان کا عدالتی نظام adversarial ہے جس میں جج اپنی جانب سے الزامات یا دفعات میں اضافہ نہیں کر سکتا، نہ ہی وہ ایسے شواہد طلب کر سکتا ہے جو استغاثے نے پیش نہیں کیے اور اس کا فائدہ ملزم کو ہوا۔ اس وجہ سے جج کو صرف ان الزامات تک محدود رہنا پڑتا ہے جو استغاثہ اس کے سامنے پیش کرتا ہے اور ان الزامات کے ثبوت کے لیے وہ صرف انھی شواہد کی طرف دیکھ سکتا ہے جو استغاثے نے اس کے سامنے پیش کیے ہوتے ہیں۔ اس لیے بعض اوقات جج کو اگر نظر بھی آئے کہ ملزم نے کسی اور جرم کا ارتکاب کیا ہے جس کا الزام استغاثے نے نہیں لگایا تو جج اپنی جانب سے کچھ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اگر جج محسوس کرے کہ استغاثے کے پاس ملزم کے خلاف ثبوت ہے لیکن وہ پیش نہیں کر رہی تو جج کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ ملزم کو تو معصوم فرض کیا جاتا ہے جب تک استغاثہ اس کا جرم ثابت نہ کرے۔ اس نظام کی وجہ سے فوجداری مقدمے کا سارا کنٹرول جج کے ہاتھ میں نہیں بلکہ استغاثے کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

اسلامی قانون میں قاضی کے پاس وہ اختیارات ہوتے ہیں جو معاصر دنیا میں ان نظام ہائے قوانین میں جج کے پاس ہوتے ہیں جنہیں inquisitorial system کہا جاتا ہے۔ اس بنا پر استغاثے کی کمزوری کی بنا پر مجرم کے بچ نکلنے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں کیونکہ اس نظام میں مقدمے کا کنٹرول استغاثے کے پاس نہیں، بلکہ قاضی/جج کے پاس ہوتا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ اسلامی قانون کی رو سے قاضی کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہوتا کہ دو فریقوں کے درمیان تصفیہ کرے بلکہ اس کا اصل کام عدل کی فراہمی اور کمزور فریق کے حق کا تحفظ ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں انگریزوں کی جانب سے نافذ کردہ adversarial system میں جج بے چارے کے ہاتھ پیر بندھے ہوتے ہیں اور پھر جب نظام کی اندرونی خامی کی بنا پر مجرم چھوٹ جاتا ہے تو ملبہ بھی جج پر ہی گرایا جاتا ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ شاہ رخ جتوئی فی الحال ضمانت پر رہا ہوا ہے اور ابھی اصل مقدمے کا فیصلہ باقی ہے۔ اس لیے اس بات کی طرف توجہ کی ضرورت ہے کہ استغاثے کی کمزوری کی وجہ سے اس کے ''باعزت بری'' ہونے کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔